ادب، تنقید اور معاشرہ

LITERATURE, CRITICISM AND SOCIETY

Dr. Javeed Iqbal*

ABSTRACT:

There is nothing styptic in the universe. Likewise the society and its norms are varying from time to time. Which reflect in anthropology as well as in the social sciences of the era. Apart from this literature also plays a vital role in the publicizing of these social changes. As the literature is an issue of the social intellect. So the uplifting of the literature is depending upon on the improvement of the intellectual level of the concerned society. Whenever the society will be fickle, the literature will be change its colors and will explore for the amiable one. Actually this exploration is known as criticism in the literary terminology. Which keep maintain the order of beauty in the creation everywhere in every age. Both the creation and criticism are reciprocal and co-relative phenomena of the social process. Which forms such a triangle, in which every angle is incomplete in the absence of another one. In this paper, these angles will be brought under consideration. From all these three angles the relationship among the literature, criticism and society, the role of literature and criticism and particularly the relationship of literature and criticism will be discussed. Also the paper is an attempt to analyze and answer the questions like, if literature is the criticism of life, why and how? What is the relation of literature to life? These question would be answer with reasons and arguments and also conclusion will be drawn on the basis of these arguments.

Keywords: Literature, Criticism, Society, social sciences.

ادب، تنقید اور معاشرہ سماجی علوم کے مباحث میں ایسے تین زاویئے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کسی طور جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان ہی تین زاویوں سے ایک ایسا مثلث بنتا ہے۔ جو انسانی زندگی کے ارتقاء کے نتیجے میں مثلث کی تکمیل کی طرف قدم گامزن ہوتے ہیں۔ اسی پس منظر میں کچھ سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں اور اسی تناظر میں علمی مباحث آگے بڑھتے ہیں۔

معاشرہ کیا ہے؟ معاشرہ میں افراد کا کردار کیا ہوتا ہے، معاشرہ کن عوامل سے ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ اس عمل میں فطری علوم (Natural Sciences) اور سماجی علوم Social Sciences کا کردار کیا ہوتا ہے۔

* Chairman, Department of Pashto, Islamia College Peshawar

اسی عمل میں فنون لطیفہ کا مجموعی طور پر اور ادب و تنقید کا خصوصی طور پر کیا وظیفہ ہوتا ہے۔ اور اسی تناظر میں ادب، تنقید اور معاشرہ کا آپس میں کیا ربط باہم ہو سکتا ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن کے جوابات دینے کی کوشش ادیب بھی کرتا ہے اور نقاد بھی، ان مسائل کو تاریخ دان بھی زیر بحث لاتا ہے۔ اور ماہر تعلیم بشریات (Anthropologist) بھی۔ یہی وہ نکتہ ہے۔ جس کے بارے میں ماہر عمرانیات (Socialogist) بھی سوچتا ہے اور ماہر سیاسی علوم (PoliticalScientist) بھی۔ مگر ان سب میں بنیادی وظیفہ ادیب اور نقاد کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ادیب اور نقاد زندگی کو بطور کل لیتا ہے۔ ادیب و نقاد کے پیش نظر انسان اور معاشرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کے تمام پہلو اور انسانی معاشرے کے ہر رخ پر وہ اظہا خیال کرتا ہے۔ ادیب و نقاد کے اس اظہار خیال کے نفسیاتی پہلو بھی ہوتے ہیں اور عمرانیاتی پہلو بھی۔ اس اظہار خیال میں موضوعیت بھی ہوتی ہے۔ اور معروضیت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سماجی علوم اور فنون لطیفہ ادب و نقد کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہوسکتے۔ یوں جب ادب، تنقید اور معاشرے کے ربط و تعلق کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ تو ابتدا معاشرہ سازی اور معاشرہ شناسی سے ہوتی ہے۔ یوں اسی بحث میں جب تہذیب، ثقافت، سیاست، مذہب تاریخ اور باقی انسانی علوم و فنون کی نقاب کشائی کرنی پڑتی ہے، تو ادیب و نقاد ہی وہ فرد ہوتا ہے، کہ ان سب پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں پہلے معاشرہ شناسوں (Socialogist) کی رائے دیکھتے ہیں۔ مغربی دانشور اور معاشرہ شناس ایلیکس اِنکلز کہتا ہے۔

"مگر کیا نفسیات، معاشیات، سیاسیات، بشریات بلکہ نقدِ فن اور ادبیات تک کو طبعی علوم کی طرح متعین، منظم اور منتقل کیا جاسکتا ہے؟ ممکن ہو یا نہ ہو، سنجیدہ سعی و تلاش کے ان سب میدانوں میں یہ کوشش ضرور ہوئی اور غالباً اِس کوشش سے ان کی سنجیدگی میں کچھ اضافہ بھی ہوا۔"(1)

ہم نے دیکھا کہ مغربی ماہر عمرانیات اِنکلز نے معاشرہ شناسی کے بنیادی علوم و فنون میں نفسیات، معاشیات، سیاسیات اور بشریات کے ساتھ ساتھ نقدِ فن (فن نقد) اور ادبیات کو طبعی علوم (فطری علوم) کی سطح پر لانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ فرد اور معاشرہ کے تعلق پر علامہ اقبال جیسے بلند پایہ شاعر و دانشور نے شعری زبان میں کتنے جامع انداز میں کہا ہے، کہ:

فرد قائم ربط ملت سے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اب اس ملت سے فرد کا ربط کیا ہے؟ اسی ربط ملت سے فرد کا تعلق ہی معاشرہ کا اساس ہے اور اگر غور کیا جائے تو اسی اساس کو مزید استحکام فنِ نقد اور ادبیات ہی دیتا ہے۔ فن نقد اور ادبیات بھی محض ایک فرد کے انفرادی شعور و آگہی سے معاشرے کے ارتقاء میں موثر کردار ادا نہیں کر سکتا بلکہ افراد کا اجتماعی شعور ہی معاشرہ

سازی کے بنیاد کو مزید استحکام بخشتا ہے۔ اسی اجتماعی شعور کو ادب کی اصطلاح میں سماجی نفسیات اور معاشرتی جمالیات جیسے اصطلاحات سے یاد کیا جاتا ہے۔ معاشرہ شناسی کے اصطلاح میں اس نقطہ نظر سے انکلز ہی کہتا ہے، کہ:

"یوں بھی اگر معاشرہ محض افراد کے مجموعے کا نام ہوتا تو اس کا کوئی مشترک ارادہ، کوئی فکری یا اخلاقی نصب العین نہ ہوتا۔ معاشرہ شناسی کا بنیادی سوال یہی ہے کہ کیا معاشرہ کوئی اجتماعی ذہن رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اگر رکھتا ہے تو کیا یہ محض اپنے تحفظ اور مفاد کے لیے آمادہ عمل ہوتا ہے؟ یہاں آکر بحث تاریخی اور تہذیبی محرکات کی طرف مڑ جاتی ہے اور معاشرہ شناسوں کو یہ سوچنا پڑتا ہے، کہ ان کے زیر مطالعہ معاشرے کی تہہ میں کون کون سے عوامل کام کرتے ہیں"۔(2)

اس پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ادب و نقد کی بات کی جاتی ہے، تو پہلے تنقید کو اجتماعی سطح پر اور پھر ادبیات کی سطح پر رکھا جاتا ہے۔ اگر ہم اس موقع پر مغربی دانشور میتھو آرنلڈ کے ایک جملے کا تجزیہ کریں جس میں انہوں نے کہا تھا، کہ (Literature is the criticism of life) تو اس ایک جملے میں ادب، تنقید اور معاشرہ کے تینوں پہلوں سامنے آتے ہیں۔ ادب اگر زندگی کی تنقید ہے تو اس کا مطلب ہے۔ کہ ادب کا واسطہ زندگی سے ہے اور زندگی ہی معاشرہ ہے تو گویا ادب معاشرتی اقدار کی تنقید ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ تنقید ہے کیا اور کس طرح زندگی یا معاشرتی اقدار سے اس کا تعلق بنتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہی ادب کا سوال اجاگر ہوتا ہے، کہ ادب ایک ذریعہ ہے اصل مقصد تو زندگی یا معاشرہ کی تنقید ہے۔ تنقید کیا ہے؟ اس سوال پر تو دانشوروں اور ادیبوں کے طویل مباحث موجود ہیں اور انہیں مباحث کو اگر مدِ نظر رکھا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے، کہ آرنلڈ کا یہ ایک جملہ محض ایک جملہ نہیں بلکہ ایک وسیع مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ تنقید کیا ہے؟ اس ضمن میں طویل مباحث کو سامنے لانے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا کہنا ضروری ہے، کہ تنقید کسی بھی علم و فن، سوچ اور نظریہ کا نمائندہ تصور کو اپنے اصلی مقام پر رکھنے اور پیش کرنے کا نام ہے۔ جس میں اصلاح وارتقاء کا پہلو بھی شامل ہو یوں اس عمل میں سیاسیات، سماجیات، مذہبیات، نفسیات، ادبیات اور باقی فطری و سماجی علوم شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر ہمارا واسطہ چونکہ ادبیات سے ہے اس لیے ہم ادبی تنقید ہی کو مد نظر رکھیں گے۔ ہاں یہ بات واضح ہے کہ خالص ادبی تنقید میں بھی مذکورہ تمام علوم و فنون زیر بحث آئیں گے کیونکہ ادب زندگی کی تنقید ہے اور زندگی میں مذکورہ علوم و فنون سب ہی آجاتے ہیں۔ اس موقع پر اگر ادبی تنقید کے ضمن میں مغربی دانشور ولیم ہنری ہڈسن کی رائے پیش کر دی جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے، کہ تنقید کیا ہے؟ اور ادبی تنقید کا وظیفہ کیا ہوتا ہے؟ یوں ادبی تنقید کا معاشرتی اقدار سے تعلق کا پہلو بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔ ہڈسن نے لکھا ہے:

"In its strict sense the word criticism means judgment, and this sense commonly colours our use of it even when it is most broadly employed. The literatrary critic is therefore regarded primarily as an expert who brings a special faculty and training to bear upon a piece of literary art, or the work of a given author examines its merits and defects, and pronounces a verdict upon it. Yet when we speak of the literature of criticism we evidently include under the term more than the literature which records judgment. We comprehend under it the whole mass of literature which is written about literature, whether the object be analysis, interpretation, or valuation, or all these combined. Poetry, the drama, the novel, deal directly with life. Criticism deals with poetry, the drama, the novel even with criticism itself. If creative literature may be defined as an interpretation of life under the various forms of literary art, critical literature may be defined as an interpretation of the interpretation and of the forms of art through which it is given"(3).

آرنلڈ اور ہڈسن کے ان ہی مجموعی نظریات کو اگر وسعت دی جائے تو مختلف تنقیدی دبستان سامنے آتے ہیں اور پھر ہر تنقیدی دبستان میں معاشرہ اور معاشرتی اقدار ہی کا عکس اجاگر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تنقید کے نفسیاتی دبستان کا مطالعہ کیا جائے تو انسانوں کے داخلی محرکات ہی کا عکس سامنے آتا ہے اور انسانوں کے داخلی محرکات کے پیچھے معاشرتی اقدار ہی ہوتے ہیں۔ جس کو سماجی نفسیات کے اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح اگر عمرانی تنقید پر نظر ڈالیں تو عمرانیات نام ہی معاشرتی اقدار کے مطالعہ کا ہے۔ تو عمرانی تنقید بھی معاشرتی اقدار ہی کے بارے میں تنقید ہو گی۔ تاریخی تنقید انسانی معاشرے ہی کے مختلف ادوار کے سوچ و فکر کی پرکھ کرتی ہے۔ جمالیاتی تنقید انسانی معاشرہ ہی کے جمالیاتی اقدار کو اجاگر کرنے کا نام ہے۔ رومانی تنقید، مارکسی تنقید، تقابلی تنقید اور باقی تنقیدی دبستانوں کو بھی اس سطح پر کھا جاتا ہے۔ جو اصل میں معاشرہ ہی کے مطالعہ و مشاہدہ کو بنیاد

بناتا ہے۔ ان تمام دبستانوں میں ادب، تنقید اور معاشرہ کے تعلق سے متعلق وضاحت کرنا تو اس مقالہ میں ممکن نہیں البتہ ڈاکٹر سلیم اختر نے تاریخی دبستان تنقید کے ضمن میں جو لکھا ہے۔ اس سے ادب، تنقید اور معاشرہ کے چند پہلو پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے:

"یہ بھی ملحوظ رہے کہ گو کسی نسل یا ماحول کے اثرات کسی ایک خاص عہد میں یکساں سطح رکھتے ہیں۔ لیکن ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر یہ یکسانیت بہت سطحی معلوم ہو گی یہ بظاہر تو ہمہ گیر معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ ہمہ گیری بالکل عمومی ہوتی ہے۔ اس لیے تو تمام ہمعصر ادیبوں میں کسی بھی عصری رجحان یا ادبی تحریک کے اثرات سو فی صدی نہیں دیکھے جاسکتے کیونکہ یہ تمام عوامل مختلف ادیبوں پر ان کی نفسی ساخت کے مطابق اثر انداز ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اکبر الہٰ آبادی، سرسید اور حالی کی مخالفت کیوں کرتے؟ جن تاریخی حالات نے سرسید اور حالی کے ادبی مشن کو جنم دیا وہ اکبر پر اس طرح کیوں نہ اثر انداز ہوئے؟ اس کا جواب محض نفسی ساخت کی پیدا کردہ انفرادیت میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ادب اور زندگی کا تعلق یکطرفہ نہیں ہوتا۔ زندگی ادب کو متاثر کرتی ہے تو ادب زندگی کو زندگی عمل کے مواقع مہیا کرتی ہے تو ادیب رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اس عمل اور رد عمل سے ہی زندگی اور ادب کا ارتقاء عبارت ہے پھر نابغہ تاریخی عوامل اور عمومی تقاضوں کے دھارے میں آنکھیں بند کر کے تنکے کی طرح نہیں بہہ جاتا بلکہ وہ نئے تجربات اور بغاوت سے تاریخی عوامل ہی کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ (4)"۔

ہم نے دیکھا کہ ادب اور تنقید کس طرح زندگی اور معاشرہ کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اسطرح کی مثالیں اگر ہم تنقید کے دیگر دبستانوں سے بھی پیش کریں تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مگر ہم مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں۔ کہ ادب اور تنقید ہی ایسی قدریں ہیں جو زندگی اور معاشرہ کو زبان دیتی ہے۔ زندگی اور معاشرہ کو پیش کرتی ہیں اور زندگی اور معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کی نہ صرف نقاب کشائی کرتی ہے بلکہ زندگی اور معاشرہ کے تحریک اور ارتقاء کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ اسی حقیقت کو نامور دانشور و نقاد سید وقار احمد رضوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ادب اور نقد زندگی کی ناطق قدریں ہیں۔ ادب زندگی کے بطن سے رونما ہوتا ہے اور نقد ادب کی تہذیب اور حسن کاری میں حصہ لیتا ہے۔ وہ زندگی کے تجربات کو پرکھتا ہے۔ اور ان قدروں کا تعین کرتا ہے۔ جو تخلیق کو نور و نکہت اور وجدانی تاثرات کو سائنسی صداقت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔" (5)

معاشرہ کے ساتھ ادب و تنقید کا رشتہ اتنا گہرا ہے، کہ معاشرہ جوں جوں اپنا رنگ بدلتا ہے۔ ادب و تنقید اس کے ساتھ ساتھ اپنا رخ بدلتا ہے۔ جیسا کہ علامہ محمد اقبال کہتے ہیں، کہ:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

تواس طرح حالی بھی کہتے ہیں کہ:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

علامہ اقبال کے بقول زمانہ کسی صورت جامد نہیں رہتا۔ ہر وقت ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ اس طرح حالی کے بقول زمانے کا یہ بدلنا اور ارتقاء پذیر ہونا دراصل خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتا ہے۔ گویا پہلی سطح پر زمانے کا بدلنا حقیقت میں معاشرتی اقدار کا بدلنا ہوتا ہے۔ جو ایک سماجی عمل ہے اس طرح دوسری سطح پر خوب سے خوب تر کی تلاش ایک تنقیدی اور ادبی عمل ہے۔ جو معاشرے کو اصلاح وارتقاء کی طرف گامزن رکھتا ہے۔ اردو کے نامور نقادو دانشور سید احتشام حسین اسی معاشرتی ارتقاء اور تغیر و تبدل کے ساتھ تنقیدی و ادبی اقدار کے بدلنے اور ارتقاء پذیر ہونے کو ایک فطری و سماجی عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

”ہر دور کے اپنے کچھ عقیدے ہوتے ہیں جن کے معیار سے تہذیب کو پرکھا جاتا ہے۔ اُس دور کے گزرنے کے بعد یہ عقیدے روایت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جن کے بعض عناصر حالات کے بدلتے ہی ختم ہو جاتے ہیں، بعض زندہ رہتے ہیں۔ یہ عقیدے سیاسی، معاشرتی، ادبی زندگی کے ہر رُخ کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ ان سب میں اندرونی طور پر ایک فلسفیانہ ربط ہوتا ہے۔ اور گہری نظر سے تجزیہ کرنیوالے اُس بنیادی انداز فکر کی تلاش کر سکتے ہیں۔ جو ہر عقیدے کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اگر اسے عمرانیات کے تحلیلی نقطۂ نظر کی مدد سے دیکھیں تو یہی معلوم ہو گا کہ معاشی معاشرتی ادارے جن طبقات میں انسانوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ انہیں کے مفاد اور قیام کی آویزش کے سلسلہ میں جو فلسفہ کام آسکتا ہے۔ وہی رائج ہوتا ہے۔ شعر و ادب سے دلچسپی لینے والے طبقے کو زندگی کی جو قدریں عزیز ہوتی ہیں اور جس طرح عزیز ہوتی ہیں۔ تنقید انہیں کو اہمیت دیتی ہے۔ وقت گزر جانے پر وہ قدریں بھی اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں“۔(6)

جب معاشرہ جمود کا شکار ہو تو ادب و تنقید خود بخود جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ چونکہ ادب زندگی ہی کی تنقید و تفسیر ہے۔ اور زندگی معاشرہ سے الگ کوئی چیز نہیں تو لازماً ایسا ہی ہو گا، کہ معاشرتی اقدار کے جمود کے ساتھ ساتھ ادب بھی محض لفاظی اور بے معنی سی لذت آمیز بن کر رہ جاتا ہے۔ یوں ادب تنقید اور تخلیق کو بھی سطحی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ادب و تنقید زندگی اور معاشرہ سے الگ تلگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ سید احتشام حسین نہایت واضح الفاظ میں کہتا ہے، کہ:

”ایک ایسے سماجی نظام میں جو ایک روبہ انحطاط فرسودہ معاشی نظام سے وابستہ ہو بڑھنے اور نئی خصوصیتیں پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اُسے سکون اور خاموشی کی جستجو ہوتی ہے اور ایک ایسا فلسفہ وجود میں آجاتا ہے۔ جو معنی کے مقابلے میں صورت کو اور مواد کے مقابلے میں ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ زندگی کے

چھوٹے چھوٹے مسائل میں خوشی کے پہلو نہ دیکھ کر مبالغہ، تصنع اور آرائش پر جان دیتا ہے۔ سطحی باتوں کو لطافت سے آراستہ کر کے لذت اندوز ہوتا ہے۔، اپنے مادی انحطاط اور زوال کو روحانیت اور تصوف کے تسکین بخش فلسفہ میں غرق کر کے اس دنیا کی حقیقت کا منکر ہو جاتا ہے۔ اور اخلاق کے ایک ایسے کمزور نظام کی اشاعت میں منہمک رہتا ہے۔ جو ایک زمانے میں سماج کے عناصر کو متحرک رکھنے کی کافی طاقت رکھتا تھا۔ لیکن اب اس میں وہ طاقت باقی نہیں رہی۔ یہ سب کچھ معاشی نظام کے فرسودہ اور جامد ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ طبقات ترقی کے راستوں سے بیگانہ اور ناواقف ہوتے ہیں۔ اور جب تک کوئی ایسی آویزش پیدا نہ ہو جائے۔ جو برسر اقتدار طبقہ کو اپنی طاقت کے قائم رکھنے کی جدوجہد کی طرف مائل کرے اور کچلے ہوئے طبقے کو ابھرنے کی ترغیب دلائے، حالات اس طرح نہیں بدلتے کہ شعور میں ان تغیرات کا اظہار ہو۔ ایسے نظام میں شعر و ادب، تخلیق و تنقید کے مواد اور اسلوب کا سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں رہ جاتا۔"(7)

یہاں ادب سے مراد صرف تبلیغ اور پروپیگنڈہ نہیں۔ ادب ادیب کے داخلیت اور تخیل آمیزی سے ہرگز خالی نہیں ہوتا معاشرتی اقدار کی ترجمانی سے یہ بھی مراد نہیں کہ ادب کو جمالیاتی قدروں سے عاری اور تخیل کی چاشنی سے خالی کر دیا جائے۔ ادیب ہر صورت میں جمالیاتی اقدار اور فنی نزاکتوں کا خیال رکھتا ہے۔ یہی وظیفہ ادبی تنقید کا ہے مگر یہ ضرور محفوظ خاطر رکھنا ہو گا۔ کہ ادیب کی تخیل آمیزی اور خیال و تصور کو بھی حقیقت کی سطح پر پرکھا جائے کیونکہ ادب او حقیقت کا بحر حال چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ نامور نقاد و دانشور انجم اعظمی ادب اور حقیقت کے اس تعلق کو یوں اجاگر کرتا ہے:

"ادب میں حقیقت کے تین مختلف معنی ہیں، واقعہ، واقعیت اور زندگی کی ماہیت۔ جب حقیقت کا لفظ واقعہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو ہم اس سے مراد لیتے ہیں، کہ جو کچھ زندگی میں ہو رہا ہے۔ اس کی عکاسی ادب میں بھی ہو رہی ہے اور حقیقت کے اسی مفہوم کو سامنے رکھ کر ادب کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے، کہ خواب اور حقیقت (واقعہ) کے امتزاج کا نام ادب ہے یعنی آدمی کا تخیل ادب کی صورت میں واقعہ کی از سرنو تخلیق کرتا ہے اور زندگی میں جس چیز کو واقعہ کا نام دیا گیا تھا۔ وہ ایک نئی صورت پالیتا ہے۔ حکماء کا کہنا ہے، کہ یہ نئی صورت زندگی کے واقعہ سے زیادہ حقیقی اور بامعنی ہوتی ہے۔ یہاں حقیقت کا دوسرا مفہوم ملتا ہے۔ یہ واقعیت ہے جس میں واقعہ اور خواب ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔"(8)

ہمیں پتہ ہے، کہ معاشرہ شناسی ایک سماجی سائنس ہے، مگر ادیب معاشرے کو ادبی زاویہ سے دیکھتا ہے۔ ادیب چونکہ سائنس دان نہیں ہوتا۔ اسلئے معاشرتی اقدار کو دیکھنے کا زاویہ بھی سائنس دان سے جداگانہ

رکھتا ہے۔ مگر معاشرہ کو دیکھنے کے اس جداگانہ زاویہ نگاہ کے باوجود ادیب اور سائنسدان دونوں ایک معاشرتی حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ ہر چند کہ دونوں کا طریقہ الگ ہے۔ انجم اعظمی اسی سلسلے میں یوں رقم طراز ہے:

"اول یہ کہ شاعر کا تخیل حقیقت کا ادراک جس انداز سے کرتا ہے۔ سائنس دان اس سے مختلف طریقہ استعمال کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ طریقہ بدل جانے سے جو حقیقت دریافت ہوتی ہے۔ وہ کسی حقیقت میں ترمیم و تنسیخ کے بجائے ایک مختلف حقیقت ہوتی ہے۔ سائنس دان کے سامنے یہ کائنات اور اس کے بھید ہیں۔ اس کائنات کی وسعت لا محدود ہے اس لا محدود وسعت میں جب ایک سائنس دان ذرے ذرے کا جگر چیر کر زندگی کی ماہیت کی خبر دیتا ہے۔ تو سائنس داں کی دریافت کی ہوئی یہ حقیقت شاعر کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ فن زندگی اور فطرت کی ماہیت دریافت کرنے کے بجائے اس سے گزر کر فطرت کی اعلیٰ ترین تخلیق یعنی متحرک انسان کی ماہیت کو دریافت کرتا ہے۔ اس طرح فن کا کام فطرت کی ماہیت دریافت کرنے کے بجائے فطرت کے معیار کی دریافت ہے اور اس اعتبار سے شاعری زندگی کی عمودی سمت ہے۔"(9)

ادب کے اس تسلسل میں کچھ ادیب ایسے ضرور ہوسکتے ہیں۔ کہ معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ چلنے کی بجائے معاشرہ کے ایک رخ کو مد نظر رکھے اور وہ معاشرتی رخ محض ایک ایسا جمالیاتی قدر بھی ہو سکتا ہے۔ جو حقیقت اور واقعاتی صداقتوں سے دور ہو۔ یہاں ایک نقاد تنقیدی اصطلاح میں یہ بھی کہہ سکتا ہے، کہ ادیب و مصنف کے شعور و احساس پر داخلیت کا اتنا غلبہ ہے، کہ وہ معروضی حقیقتوں سے آگاہی نہیں رکھتا۔ مگر ادبی نقاد ایسے شاعر و ادیب کو بھی ضرور ہدف تنقید بنائے گا۔ جو معروضی حقائق سے بے خبر ہو اور یا معروضی حقائق سے چشم پوشی کرتا ہو۔ ظہیر کاشمیری اس پس منظر میں کائنات (زمانہ)، معاشرہ، جمالیاتی اقدار، ادیب کے کردار اور مصنف کے فکر و نظر کے بارے میں لکھتا ہے۔

"کائنات ایک مسلسل عمل کی حامل ہے۔ فنی یا جمالیاتی اقدار کی تخلیق معنف کو منطقی طور پر ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر نہیں لے جاسکتی جب تک کہ وہ گردوپیش کو ایک مسلسل عمل تسلیم نہ کرے۔ تمام افراد کائنات میں تو دلچسپی لے سکتے ہیں لیکن اس کے کسی مخصوص ہے۔ یا چند فنی یا جمالیاتی اقدار میں نہیں اس وجہ سے داخلی ادب لوگوں کی اکثریت سے کٹ جاتا ہے اور ایک مختصر گردہ کی ترجمانی کو اپنا شعار بنالیتا ہے۔ اس مضر تجربے سے بچنے کے لیے مصنف کو یہ بنیادی اصول ماننا پڑتا ہے۔ کہ ہر مادی وجود ایک مستقل خارجی عمل کا حصہ ہے اس نظریئے کا ذہنی اثبات سوچنے والے کو ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر لے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس قسم کا ادب تفصیل کے اعتبار سے عملی اور جامعیت کے اعتبار سے تمام کائنات پر محیط ہو سکتا ہے۔"(10)

البتہ وہ میکسم گورکی جیسے بلند پایہ دانشور کا حوالہ دیتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتا کہ معاشرتی اقدار میں جس تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ انسانی شعور اُسی تیزی سے ترقی نہیں کرسکتا۔ ادیب و مصنف اپنی شعوری ارتقاء کے سطح ہی پر رہ کر معاشرتی اقدار کی بدلتی ہوئی صورتحال اور ارتقاء کا ترجمانی کرسکتا ہے۔ وہ داخلیت و خارجیت کے اس توازن و تناسب کو اجتماعی شعور اور معاشرتی زندگی کے اس سطح پر دیکھتا ہے۔ جس کو وہ جماعتی جنگ یعنی اقدار کے تصادم یا مادی جدلیات کے تناظر میں دیکھ سکے۔ وہ لکھتا ہے۔

”جماعتی جنگ کا شعور کوئی بے مزاحمت فعل Passive Activity نہیں بلکہ ہر مصنف اُس کا اکتساب کرتا ہے اور اس اکتساب میں اُس کی بدنی اور ذہنی کاوشوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ معاشرہ کے مختلف طبقے معنف پر اپنا عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کا ایک ناگزیر حصہ ہے وہ ہر عمل کا ردعمل کی صورت میں جواب دیتا ہے۔ اور اس عمل اور ردعمل کی ساری میکانیت Machinism کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کی یہ کوشش فطری کوشش ہے۔ جو اسے معاشرہ کے جماعتی نذاع کو حالات کے مطابق سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ معاشرہ کی طبقاتی تبدیلی اور مصنف کی شعوری تبدیلی کوئی متوازی عمل نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ خارجی حالات کی ہر معمولی تبدیلی مصنف کی شعوری تبدیلی کا باعث بن جائے عملی مشاہدہ ثابت کرتا ہے۔ کہ انسانی ذہن خارجی حالات کی رفتار کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ مقابلتاً بہت سست ہے۔ خارجی اصلیت انسانی دماغ کو ہمیشہ پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ کیونکہ انسانی دماغ جو اسے پیدا کرتا ہے۔ بہت آہستہ آہستہ ترقی کر کے تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اصلیت انسانی دماغ کو مطمئن کر دے اور جیسا کہ ظاہر ہے۔ اطمینان تساہل کی بنیاد ہے۔ اصلیت تاریخ کے لا محدود اور دانش میدانہ محرکات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ترقی کرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ اس قاعدہ کے مطابق ایک ہی زمانے کے مصنف ایک ہی حالات میں رہتے ہوئے مختلف طریقوں پر فکر کرتے ہیں۔“(11)

ادب، تنقید اور معاشرتی ارتقاء کے ربط و تعلق میں ہمیں معلوم ہوا کہ جس رفتار سے بھی ممکن ہو مگر معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ادب و تنقید کا بھی ارتقائی اور بدلتی ہوئی صورت سامنے آتی ہے۔ معاشرتی ارتقاء کے اس صورت حال کو ہم زندگی کے ارتقائی منظر نامہ سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ اور اسی تناظر میں ہم آرنلڈ کے اُس قول کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ ادب اگر زندگی کی تنقید ہے۔ تو گویا ادیب اپنے تنقیدی رجحان ہی کی مدد سے زندگی کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ اور زندگی کی اس تعبیر کو منعکس کرتے ہوئے وہ تمام سماجی تبدیلیوں پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اسطرح ہر معاشرے، ہر خطے اور ہر ملک کے افراد کی زندگی ایک طرح کی نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر دور اور ہر زمانے کے تہذیبی اقدار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ادبی تنقید کا بھی تقاضا یہ ہے کہ مختلف ادوار اور مختلف معاشروں میں ادب اسی بدلتی ہوئی ارتقائی صورت میں جلوہ گر ہو جیسا کہ ممتاز دانشور علامہ نیاز فتح پوری نے بھی کہا ہے، کہ:

"ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے ان تمام تجربات و احساسات کا جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ گویا با الفاظ دیگریوں کہہ سکتے ہیں، کہ ادب زندگی کا اظہار ہے الفاظ کے ذریعہ سے اور اس لیے جس طرح ادب کی تخلیق زندگی سے ہوتی ہے، اسی طرح زندگی کی تخلیق بہت کچھ ادب پر منحصر ہے۔ ہر چند اقوام کے مختلف خصائص، افراد کے مختلف مزاج اور ملکوں کے مختلف سیاسی و معاشرتی حالات ادب کی مختلف شکلیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان میں ادب کی کوئی شکل ایسی نہیں ہے۔ جس میں روح انسانی کا اظہار کیا گیا ہو جس میں میلانات حیات کی تشریح نہ کی گئی ہو اور تجربات زندگی کے تجربے سے جس میں کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز بات نہ پیدا کی گئی ہو۔"(12)

اب آگے دیکھیے کہ علامہ نیاز فتح پوری ادبیات اور نقد کو کس طرح آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان دونوں یعنی ادبیات اور تنقید کا زندگی اور معاشرہ سے کس طرح ربط و تعلق کا جواز بتاتا ہے۔

"ادبیات میں سب سے زیادہ بلند چیز تخلیقی ادب Creative Literature ہے۔ جس سے مراد زندگی کی تشریح سے اس لیے ایک بلند انتقاد کا صحیح مدعا یہ ہونا چاہیے کہ ادبیات کی تمام ان صورتوں پر غور کرے جن کے ذریعہ سے زندگی کی تشریح کی جاتی ہے، اس غور سے جو نتیجہ ہو وہی ایک نقاد کا فیصلہ کہلائے گا۔ ادبیات میں تین مختلف قوتیں سرگرم کار پائی جاتی ہیں، ایک قوت تصنیف دوسری قوت لذت اندوزی اور تیسری قوت انتقاد، ان تینوں قوتوں میں سے اول الذکر دو قوتوں کا وجود پہلے پایا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد قوت انتقاد اپنا کام کرتی ہے۔ جونہی ایک شخص کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ ایک سے زائد چیزوں میں سے کسی خاص چیز کو ترجیح دینا چاہیے۔ انتقاد شروع ہو جاتا ہے۔"(13)

اس اقتباس میں ہم نے دیکھا کہ نیاز فتح پوری نے ادبیات اور نقد کو لازم و ملزوم سمجھا ہے اور پھر زندگی کی دیکھنے کے زاویئے بھی ادب اور تنقید دونوں کے ایک جیسے بتائے ہیں۔ انہوں نے ادب کا مجموعی تذکرہ تو کیا ہے۔ مگر تخلیقی ادب کو خصوصی طور پر مد نظر رکھا ہے۔ سید احتشام حسین بھی ادب اور نقد کے اس لازوال رشتے کو اجاگر کرتے ہیں۔ مگر زندگی کو دیکھنے کے زاویئے کو وہ نظریاتی تناظر میں دیکھتا ہے اور اس عمل کو وہ ادب، نقد اور نظریہ کے مثلث کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح تخلیقی ادب کو بطور خاص مد نظر رکھتا ہے، جس طرح علامہ نیاز فتح پوری نے مد نظر رکھا ہے۔ سید احتشام حسین کا نقطہ نظر بھی دیکھتے ہیں۔

"ادب اور تنقید کا تعلق اتنا گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ انہیں بالکل دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا درست نہ ہو گا۔ یوں عام طور پر سمجھنے کے لیے ادب اور نظریہ ادب میں فرق ہے۔ لیکن ادب کے تخلیقی عمل ہی میں تنقیدی عمل کی نمود بھی ہو جاتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تخلیقی ادب

پیدا کرنے والا اپنے جذبات، خیالات اور تجربات کو ترتیب دے کر خاص اسلوب اور لطافت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کی وہ تنقیدی صلاحیت جسے وہ ابتدا اپنے خیالات کی تہذیب اور تنظیم میں صرف کرتا ہے، بعض نفسیاتی اثرات اور وفورِ جذبات کی وجہ سے کافی نہیں ہوتی، پھر بھی یہ صلاحیت جتنی قوی ہوگی تخلیقی کارنامہ اسی قدر اعلیٰ اور بے داغ ہوگا۔ اس طرح در حقیقت ادب اور نظریہ ادب میں تضاد نہیں ہے۔ ادیب اور نقاد دونوں ادراک حقیقت کے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن خاص طرح کی سماجی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے زندگی سے مختلف نتائج نہیں نکال سکتے۔ جہاں یہ صورت رونما ہوتی ہے وہاں ادیب اور نقادمیں اختلاف رائے ہوتا ہے۔"(14)

ادیب کی اس عصری شعور اور تہذیبی ذمہ داری کو ڈاکٹر جمیل جالبی ادیب کی سماجی ذمہ داری سے تعبیر کرتا ہے۔ اُن کا انداز بیان اور اسلوب اپنا ہے۔ مگر بنیادی بات وہی کرتا ہے، کہ ادیب اپنے معاشرے اور عصری شعور کا ترجمان ہوتا ہے اور وہ اپنے فن میں سماجی حقیقتوں کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے۔ کہ تنقیدی عمل بھی جاری و ساری ہو اور ادیب کی معاشرتی ذمہ داری بھی پوری ہو رہی ہو وہ ادیب کو سماج کا آئینہ دار اور اس کے ادب و تخلیق کو سماجی آگہی کا آئینہ سمجھتا ہے اور یوں رقم طراز ہوتا ہے۔

"ادیب کی ذمہ داری یہ ہے، کہ وہ ادیب رہے ہرکارہ نہ بن جائے۔ اس کا فن ہی اس کا خدا ہے۔ اس طرح وہ اس بات کے اظہار سے کہ دوسرے لوگ کیا محسوس کر رہے ہیں وہ انہیں زیادہ باشعور بنا دیتا ہے اور اسی شعور کے ذریعہ وہ ان کے احساسات کو بدلتا ہی جاتا ہے اور انہیں ان احساسات سے جو وہ پہلے سے محسوس کر رہے تھے اور زیادہ باخبر کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اظہار کے ذریعہ خود انسان کو اپنی ذات سے باخبر کر دیتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ان احساسات سے بھی روشناس کرا دیتا ہے جو اس سے پہلے ان کے تجربے میں نہیں آئے ہیں، اسی لیے ادب اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے بڑے واضح اور غیر واضح سارے عکس نظر آتے ہیں۔ جو ادیب اپنے دور کے لیے یہ کام نہیں کرتا وہ نہ صرف غیر ذمہ دار ہے بلکہ اس کے ادیب ہونے پر بھی شک کیا جا سکتا ہے یہی وہ سماجی شعور ہے جسے ادیب مختلف طریقوں سے سامنے لاتا ہے۔"(15)

ترقی پسند نقادوں نے اس سماجی حقیقت نگاری اور معاشرتی اقدار کی ترجمانی کو ایک سطح پر سماجی نفسیات کی روشنی میں دیکھا ہے اور دوسری طرف مارکس کے طبقاتی شعور کے تناظر میں۔ اس پس منظر میں ترقی پسندوں نے تنقیدی دبستانوں میں "مارکسی تنقید" کے نام سے ایک تنقیدی دبستان کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جس کا اساس مارکسی نظریات ہے مگر بنیادی ہدف معاشرتی ناہمواری اور طبقاتی معاشرے کے خدوخال کو ادب و تنقید کے ذریعے اُجاگر کرنا۔ نامور روس دانشور لوناچرسکی نے "مارکسی تنقید کا مسئلہ" اجاگر کرتے ہوئے ادبی تنقید، سماجی

حقیقت نگاری اور تخلیقی ادب تینوں کا ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی سماجی نفسیات کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”مارکسی ناقد کو یہ سماجی تجزیہ کس طرح کرنا چاہیے؟ مارکس ازم سماجی زندگی کو بطور عمل پیش نظر رکھتا ہے۔ جس کے علیحدہ علیحدہ حصے ہیں۔ جو ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ اور اس میں نہایت فیصلہ کن رول مادی اور اقتصادی رشتے اور ان سب کے اوپر انسانی محنت کرتے ہیں۔ مثلاً مارکسی ناقد کو ایک عہدے کے عمومی تجزیئے میں اس عہد کے تمام سماجی ارتقاء کی تصویر کھینچنی چاہیے جب کسی ادیب یا کسی تخلیق پر بحث کی جارہی ہو تو اس وقت بنیادی اقتصادی صورتحال کے تجزیئے کی ضرورت نہیں کیونکہ درست اصول جو پلیخانوف اصول کہلاتا ہے۔ بطور خود سامنے آجاتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ کسی سماجی میں ادبی تخلیق کا انحصار اس کی محض تخلیقی نوعیت کی حد تک غیر اہم ہے بلکہ اس کا انحصار سماج کے طبقاتی ڈھانچے اور اس نفسیاتی رابطے پر ہے۔ جو طبقاتی مفاد کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ شعوری ہو کہ غیر شعوری ہر ادبی تخلیق ہمیشہ اس طبقے کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے جس کی ادیب نمائندگی کرتا ہے۔ بات یہ ہو یا جیسا اکثر ہوتا ہے کہ ادبی تخلیق مختلف عناصر کی بات کرتی ہو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متعدد طبقات کے اثرات رکھتی ہے اس کا پورے غور فکر سے تجزیہ کیا جانا چاہیے۔“(16)

جب ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں میں زندگی اور اسکے حقائق و معارف کو ادب کا حصہ بنانے سے متعلق مباحث ہونے لگے تو ”ادب برائے ادب“ اور ”ادب برائے زندگی“ کے تصورات بھی سامنے آنے لگے۔ اس طرح ”آرٹ برائے آرٹ“ اور ”آرٹ برائے زندگی“ کے اصطلاحات بھی عام ہونے لگے مگر ان مباحث میں بھی ترقی پسند دانشور اس رائے کی تائید کرتے رہے کہ ادب زندگی کیلئے ہوتا ہے۔ اور آرٹ زندگی ہی کی ترجمانی کرتا ہے ادب و آرٹ کا اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں۔ روسی دانشور جی پلیخانوف نے اس تناظر میں لکھا ہے، کہ:

”آرٹ کو بھی کسی مفید مقصد کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ محض لطف اندوزی کے لیے۔“(17)

غرض ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ہی زندگی کی حقیقتوں کو واضح اور اپنی تحریروں میں منعکس کرنا ہے۔ مگر اس وضاحت و انعکاس کے ساتھ جب تخلیق کاروں اور ادیبوں کا تجزیہ بھی شامل ہو اور معاشرتی ارتقاء اور طبقاتی شعور کو اجاگر کرنا بھی ادب کا حصہ ہو تو گویا لکھنے والے ایک تنقیدی عمل سے بھی گزرتے ہیں۔

لہذا جب ہم ادب کا مطالعہ اس نہج سے کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ادب و تنقید پہلی ہی سطح پر زندگی اور معاشرہ سے سروکار رکھتے ہیں۔ مگر ہم اس تسلسل کو یوں دیکھتے ہیں۔ کہ پہلے تو ادب ہی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ جیسے آرنلڈ نے کہا تھا و ساتھ ہی خوب سے خوب تر کی تلاش کا عمل بھی جاری ہوتا ہے۔ جو ایک تنقیدی عمل ہے، یوں کہا جاسکتا ہے، کہ ایک طرف تو تنقیدی عمل ادب کے تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ دوسری

طرف ادب و تنقید جب پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ تو گویا زندگی سے وابستہ تمام علوم وفنون اس زمرے میں آجاتے ہیں۔ اگر خالص تنقیدی عمل اور معاشرہ سے اس کے ربط کو بھی دیکھا جائے تو معاشرہ تنقیدی عمل کے بغیر جامد و ساکن ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ایسا تو ممکن نہیں کہ معاشرہ جامد و ساکن ہو تو پھر یہی فطری نتیجہ ہے کہ تنقیدی عمل بھی جامد و ساکن نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نتیجہ یہی سامنے آتا ہے۔ کہ جیسے جیسے معاشرتی شعور ارتقاء کے عمل سے گزرتا ہے۔ ویسے ہی ادب اپنا رُخ بدلتا ہے اور ادب کا یہی رُخ بدلنا تنقیدی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر مشاہدہ بھی یہی ہے اور مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے۔ تاریخ بھی اس کی گواہی دیتا ہے اور علم بشریات Anthropology بھی اس پر دال ہے۔ اگر سماجیات کے مطالعے کا ماحاصل بھی یہی ہے اور نفسیاتی تجربات بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر فطری علوم Natural Science بھی یہی نتائج دیتے ہیں اور سماجی علوم Social Sciences کا بھی یہی استدال ہے۔ تو ہمیں بھی اسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ کہ ادب، تنقید اور معاشرہ باہمی تعلق و ربط کے لحاظ سے ایک ایسا مثلث ہے۔ جس کا ہر ایک زاویہ دوسرے زاویئے کو استحکام و دوام بخشتا ہے اور ان ہی تین زاویوں سے اس مثلث کی نہ صرف تکمیل ہوتی ہے بلکہ یہ مثلث جب دائرے کا شکل اختیار کرتا ہے۔ تو یہ چکر ادب، تنقید اور زندگی کے تسلسل کو دوام بھی بخشتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ایلیکس انکلز، معاشرہ شناسی (سوشیالوجی) مترجم (مظفر علی سید) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1996، ص 12

۲۔ ایضاً۔ ص 14، 15

3.Hudson, william, Herny, An Introduction to the study of literature, George G Harraf and Co Ltd. Sydney, 1969, PP.260-261

۴۔ سلیم اختر، تنقیدی دبستان، مکتبہ عالیہ لاہور (س ن)، ص 42، 43

۵۔ رضوی، وقار احمد، سید، ڈاکٹر، معروضی تنقید، رائل بک کمپنی کراچی، 1989، ص 39

۶۔ احتشام حسین، سید، روایت اور بغاوت ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن، 1947ء، ص 17، 18

۷۔ ایضاً، ص 19، 18

۸۔ اعظمی، انجم، ادب اور حقیقت، کراچی اشاعت گھر، جنوری 1979ئ، ص 19

۹۔ ایضاً، ص 21، 20

۱۰۔ کاشمیری، ظہیر، ادب کے مادی نظریئے، کمال پبلشرز لاہور (س ن)، ص 18، 17

۱۱۔ ایضاً، ص 19، 18

۱۲۔ فتح پوری، نیاز، ادبیات اور اصول نقد، مشمولہ، تنقیدی نظریات، (مرتبہ سید احتشام حسین) عشرت پبلشنگ ہائوس لاہور، (س ن)، ص 44، 45

۱۳۔ ایضاً، ص 50

۱۴۔ احتشام حسین، سید، تنقید، نظریہ اور عمل، مشمولہ، تنقیدی نظریات، ص 126، 125

۱۵۔ جالبی، جمیل، تنقید اور تجربہ، مشتاق بک ڈپو کراچی، 1967، ص 70

۱۶۔ لوناچرسکی، مارکسی تنقید کا مسئلہ، مشمولہ آرٹ اور سماجی زندگی مکتبہ افکار نو پشاور (س ن)، ص 88، 89

۱۷۔ پلیخانوف، جی، آرٹ و سماجی زندگی، مشمولہ آرٹ اور سماجی زندگی، ص 8